محسن خالد محسن
لیکچرر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ شاہ حسین ایسوسی ایٹ کالج، لاہور
عظمیٰ نورین
لیکچرر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ ویمن یونی ورسٹی، سیال کوٹ
امامہ ریاست
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبۂ اردو، نادرن یونی ورسٹی، نوشہرہ

عبداللہ حسین کے ناول ”باگھ“ میں سیاسی، رومانی اور معاشرتی مسائل کا انسلاک

Abstracts

The Connection of Political, Romantic and Social issues in Abdullah Hussain’s novel *Bagh*

By Mohsin Khalid Mohsin, Lecturer, Dept. of Urdu, Govt. Shah Hussain Associate College, Lahore.

Uzma Noreen, Lecturer, Dept. of Urdu, Govt. Women University, Sialkot.

Umama Riasat, PhD Scholar, Dept. of Urdu, Northern University, Noshehra.

Abdullah Hussain (1931-2015) is a successful novelist, and the integration of the entire narrative of politics, romance, and society in his novel affects the reader at every level. *Bagh* (1982) is a novel in which Abdullah Hussain presents political degradation, romantic curiosity, and social hatred in a trinity narrative. This novel tells us how negative teachings thrive in the mature minds of Eastern society, poisoning all aspects of human life. This article presents a political, romantic, and social analytical study of Abdullah Hussain's novel *Bagh*, which examines Pakistani society in terms of international social values

and the love that is hurt by the hypocritical actions of its hypocritical characters. The entire scenario of the captivity of self-interested desires in the emotions.

Keywords: Udas Naslain, Terrorism, 9/11, Police, Azad, Kashmir, Love, Liberation War, Symbolism, Military Dictatorship.

کلیدی الفاظ: اداس نسلیں، دہشت گردی، 9/11، پولیس، آزاد، کشمیر، رومانویت، جنگِ آزادی، علامت نگاری، فوجی آمریت

پاکستانی ناول کی تاریخ میں عبداللہ حسین کا نام کسی پہچان یا تعارف کا محتاج نہیں ہے کیوں کہ ان کا ہر ناول ہی اپنی مثال آپ ہے۔ ان کا ناول باگھ بہ ظاہر تو محبت و موت کی کہانی ہے لیکن مصنف نے اس ناول میں کشمیریوں کی بے بسی اور معاشرتی مجبوریوں کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے نیز ہمارے ملک میں محکمہ پولیس کی ناانصافیوں کو بھی منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ اس ناول میں پاکستان کے اور بہت سے اداروں کی بے حسی و بے پرواہی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے مسائل کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

سید عبداللہ حسین جن کا اصل نام محمد خان تھا، ۱۴اگست ۱۹۳۱ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ جب آپ کی عمر پانچ برس ہوئی تو آپ اپنے آبائی شہر گجرات آئے اور سولہ برس تک وہیں قیام کیا، اس دوران آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم بھی گجرات سے حاصل کی اور پھر ۱۹۵۲ء میں بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کر کے جہلم کی ایک سیمنٹ فیکٹری میں بطور کیمسٹ ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں داؤد خیل (میانوالی) کی ایک سیمنٹ فیکٹری میں بطور کیمیکل انجینئر تعینات ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں مزید پڑھائی کے لیے کینیڈا چلے گئے اور وہاں سے واپسی پر چند ماہ یورپی ممالک میں سیر و سیاحت کی غرض سے رکے۔ اس قیام کے دوران آپ کی ملاقات ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، سارترے اور ہیمنگوے وغیرہ جیسی شخصیات سے ہوئی۔

عبداللہ حسین کی والدہ ان کے بچپن میں ہی اللہ کو پیاری ہوگئیں جب کہ والد کا انتقال ۱۹۵۶ء میں ہوا۔ والد کی موت عبداللہ حسین کے لیے اتنا شدید صدمہ ثابت ہوئی کہ جس کی وجہ سے آپ کئی ماہ تک نروس بریک ڈاؤن کا شکار رہے کیوں کہ والد کے ساتھ انھیں بے حد لگاؤ تھا اور انھوں نے ہی عبداللہ حسین کو اس کائنات اور اس میں پائے جانے والی ہر جاندار اور بے جان چیز سے روشناس کرایا۔ اس کے علاوہ شکار، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا، محبت، دوستی، دشمنی اور عزت و ناموس جیسی بے شمار حقیقتوں اور جذبات سے بھی واقفیت دلائی۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موت جیسی اذیت ناک سچائی کو بھی عبداللہ حسین نے اس وقت بڑے قریب سے محسوس کیا جب ان کے والد ایک طویل عرصہ تک بستر مرگ پر پڑے اپنی بیماری سے نبرد آزما ہوتے ہوئے بڑی آہستگی کے ساتھ موت کی آغوش میں جا رہے تھے۔ یہ وہ لمحات تھے جنھوں نے عبداللہ حسین کو یہ باور کرایا کہ انسان کی زندگی میں موت ایک ایسے کی حیثیت رکھتی ہے۔عبداللہ حسین ایک بہترین افسانہ نگار اور ناول نویس کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپ کی ادبی تخلیقات میں افسانے، ناول، ناولٹ اور ایک خود نوشت شامل ہے جن کی تفصیل کچھ اس طرح سے پیش کی جاتی ہے۔

عبداللہ حسین کا پہلا ناول جسے انھوں نے پانچ سال کے عرصہ میں لکھا اس کا نام "اداس نسلیں" ہے جو ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا اور ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ بہت سے لوگوں نے اسے اردو کا بہترین ناول قرار دیا۔ اس ناول پر آپ کو "آدم جی" ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ۱۹۸۱ء میں پانچ کہانیوں اور دو ناولٹوں پر مشتمل مجموعہ "نشیب" منظر عام پر آیا۔

ناول اداس نسلیں کے کم از کم اٹھارہ سال بعد ان کا دوسرا ناول "باگھ" ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۸۹ء میں ناول "قید" کی اشاعت عمل میں آئی۔ ناول "رات" ۱۹۹۴ء میں چھپا جس کے دو سال بعد ان کا ضخیم ناول "نادار لوگ" ۱۹۹۶ء میں منظر عام پر آیا۔ ۲۰۱۲ء میں چھے کہانیوں پر مشتمل مجموعہ "فریب" شائع ہوا۔ "آدم جی" ایوارڈ کے علاوہ عبداللہ حسین کو "کمال فن" ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ انھوں نے ایک طویل عرصہ تک سرطان جیسی موزی بیماری سے جنگ کی مگر یہ بیماری اس دراز قد، ہنسنے ہنسانے والے، لباس کے معاملے میں لاابالی شخص کو اتنے جلدی شکست نہ دے سکی۔

اس دوران انھوں نے خود کو کہانیوں سے جوڑے رکھا اور ناول کو سوانحی عناصر سے ہٹ کر ایک نئی جہت سے روشناس کروایا اور بلآخر ۴ جولائی ۲۰۱۵ء کو اس فانی دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے لیکن اپنے پیچھے شاہکار و لازوال ادبی تصنیفات چھوڑ گئے جو ہمیشہ قارئین کے دلوں میں ان کی یادوں کو زندہ رکھیں گی۔عبداللہ حسین نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے اردگرد کے معاشرے سے جو کچھ حاصل کیا اور سمجھا اسے اپنی تحریروں کا خاصا بنایا۔ ان کا ناول "اداس نسلیں" گزشتہ کئی برسوں سے ادبی منظر نامے پر بڑی شان سے اپنے قدم جمائے ہوئے ہے۔

یہ ناول ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء تک کے عرصہ پر محیط ہے۔ ناول باگھ زندگی کی پر اسراریت اور محبت پر مشتمل ہے۔ ناول قید میں انھوں نے انسان کی بے بسی، استحصال اور خواہشات کی عدم تکمیل سے پیدا ہونے والے مسائل کو موضوع بنایا۔ یہاں زیرِ تحقیق ناول باگھ میں پائے جانے والے معاشرتی مسائل پر بات کی جائے گی۔ ناول "باگھ" جو کہ عبداللہ حسین کا دوسرا اہم فن پارہ ہے ۱۹۸۲ء میں پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا۔ یہ ناول تین ابواب اور ۳۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

عبداللہ حسین کا پہلا ناول اداس نسلیں جو کہ باگھ سے تقریباً بیس سال پہلے شائع ہوا تھا میں جنگ آزادی و تقسیم ہند سے پہلے کے واقعات قلم بند کیے گئے جب کہ ناول باگھ میں آزادی کے بعد کے حالات کو پیش کیا گیا۔ یہ ناول ہندوستان

اور پاکستان کے مابین ہونے والی ۱۹۶۵ء کی جنگ کے تناظر میں کشمیر میں کی جانے والی تخریب کاریوں کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اب تک کشمیر کے موضوع پر جتنے بھی ناول ضبط تحریر میں لائے گئے ان میں باگھ کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ باگھ ایک علامتی ناول ہے لیکن اس کے باوجود اس کی زبان آسان اور قابل فہم ہونے کی وجہ سے اسے اردو ناولوں میں معیاری رتبہ حاصل ہے۔معنویت کے اعتبار سے یہ ناول دو سطحوں پر تقسیم نظر آتا ہے یعنی ظاہری اور باطنی۔

ظاہری اعتبار سے اس ناول کا اصل موضوع محبت ہے اگر اس ناول کو محبت کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ خاصا کامیاب ہے۔محبت کا یہ کھیل بہت دلچسپ، نرالا، قابل رحم اور حیرت انگیز ہے اس کے ساتھ ساتھ محبت کے تمام لوازمات اس میں موجود ہیں لیکن اگر باطنی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ناول ڈکیٹرشپ، مارشل لا اور فوجی آمریت کے جبر و تشدد کو ظاہر کرتے ہوئے معصوم لوگوں کو بنا کسی جرم کی پاداش کے اپنے شکنجے میں پھنساتے ہوئے سرحد پار تخریبی سرگرمیوں میں استعمال کیے جانے کی وجہ سے بطور احتجاج لکھا گیا۔

اصل کہانی کے ساتھ ساتھ اس ناول میں ایک باگھ کی موجودگی بھی دکھائی گئی ہے جو صرف رات کو دھاڑتا اور معصوم لوگوں کو اپنے خوف میں مبتلا کرتا ہے لیکن دن کے وقت اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس پورے ناول کے مطالعہ کے دوران باگھ اہمیت کا حامل نہیں ہے لیکن اگر گہرائی سے مشاہدہ کیا جائے تو باگھ ایک انتہائی معنی خیز علامت ہے۔

''باگھ'' میں عبداللہ حسین نے ہند و پاک چپقلش اور خوف کی علامت کو باگھ کے ذریعے نمایاں کیا ہے۔ باگھ یکے بعد دیگرے فوجی آمروں کے ہاتھوں دہشت زدہ کیے جانے والے ان پاکستانی حریت پسندوں کی داستان ہے جو انسانیت کش اور غیر انسانی مشینری سے اپنی آنے والی نسلوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ملک میں مختلف طرح کی مشکلات اور تکالیف جھیل کر جدوجہد کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔

اسی طرح جنگل کا یہ باگھ بھی ایک خونخوار اور دھوکہ باز آمر ہے جو بہت سے بے گناہ لوگوں کی زندگیوں سے کھیل چکا ہے۔ عبداللہ حسین نے بہت سارے موضوعات کو اکٹھا کر کے ایک خاص انداز میں جو ناول لکھا اسے باگھ کا نام دیا یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول پر دریا کو کوزے میں بند کرنے کی مثال صادق آتی ہے۔عبداللہ حسین ادب کی طاقت اور جدوجہد آزادی میں لفظ کی اہمیت سے بخوبی روشناس ہیں۔ وہ ادب کو اقتدار کا مخالف دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ روزنامہ جنگ کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہا:

> ''میں Subversion کو اس معنی میں استعمال نہیں کرتا کہ آپ انھیں اور حکومتی نظام کو تہس نہس کر دیں۔ جب آپ ایک نیا خیال ادب میں وارد کریں گے تو وہ آپ کی ذہنیت کو بدلنے پر قادر ہوگا۔یعنی آپ ایک نئے انداز میں دیکھنا شروع کریں گے۔آپ نے جو رائے مرتب کی جس کی مدد سے آپ کے خیالات اور نظریات وضع

ہوئے، وہ اس کی مدد سے Subvert کرلے گا۔ اس طرح آپ کا عمل بدل سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو ادیب کے نظریے کو حکومت کوئی اہمیت نہیں دیتی اور ادیب کو غیر ضروری سمجھ کر یہ کہہ دیتی ہے کہ جو کہتے ہیں وہ کہتے رہیں۔ لیکن جن ممالک میں خواندگی کی شرح بہت زیادہ ہے اور لوگ ادب کا مطالعہ کرتے ہیں وہاں حکومت کو سب سے زیادہ خوف ادیب اور فن کار سے ہی ہوتا ہے۔''(۱)

ناول باگھ نہ صرف ناول نگاری میں بلکہ اردو زبان کے احتجاجی ادب میں بھی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول کو دنیا کی تمام زبانوں کے اعلیٰ فن پاروں کے مدمقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔ ناول کے کردار اس کی ہئیت، مکالمے، اسلوب، منظر کشی، ماجرا الغرض کہ سب ہی کچھ عبداللہ حسین کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اس ناول کی علامتی اور استعاراتی خوبیوں نے عبداللہ حسین کو مزید قوت اور استقامت عطا کی ہے۔ عبداللہ حسین کے اس ناول کے ساتھ ساتھ ان کے دیگر ناولوں میں بھی ان کے تجربے اور مشاہدے کی جو گہرائی اور فنی پختگی موجود ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ عبداللہ حسین نے تخلیقی ارتقا کی کئی منازل کامیابی سے طے کی ہیں۔

ناول باگھ میں اسد کریم مرکزی کردار کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتا ہے جو کہ ایک سیدھا سادہ دیہاتی نوجوان ہے۔ اس کا باپ ایک شکاری تھا اور اپنے ہر شکار پر اسد کو ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ اسد کے والد نے اسے بتایا کہ اس نے ساری زندگی بہت سے شکار کیے لیکن شدید خواہش رکھنے کے باوجود وہ باگھ کا شکار نہ کرسکا۔

یہی بات اسد کے ذہن میں بیٹھ گئی چنانچہ والد کی طرح تمام عمر اسد بھی باگھ کے شکار کی تلاش میں ہی رہا۔ اسد جب تیرہ برس کا ہوا تو اس کے والد اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے جس کے بعد اسد کے چچا اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے۔ اسد کے چچا ایک کسان تھے جو طبعیتاً سادہ اور تنہائی پسند تھے۔

ہمارے معاشرے میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ جو کم ظرف اور چھوٹے ذہن کے لوگ ہوتے ہیں وہ ہمیشہ دوسروں کی چیزوں اور دولت پر نظر رکھتے ہیں جب کہ جن کی نظریں بھری ہوتی ہیں وہ کبھی بھی ایسا نہیں کرتے بالکل اسی طرح اسد کے چچا کو بھی اسد کے گھر، مال و اسباب یا دولت کی کوئی لالچ نہیں ہوتی اور وہ بھائی کی وفات کے بعد صرف اپنے بھتیجے کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے آتے ہیں۔ اس حوالے سے ناول ''باگھ'' سے لیا گیا یہ اقتباس دیکھئے:

"اسد کے چچا نے اپنے بھائی کے مکان سے ایک شے بھی نہ اٹھائی۔ جو کچھ تھا وہ پیٹیوں، صندوقوں، بکسوں اور کھوکھوں میں اچھی طرح بند کرنے کے بعد ترتیب سے ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیا۔"(۲)

اسد کی طبیعت میں کہانیاں بنانا اور مختلف طرح کے خیالات کو ترتیب دینے کا شوق بھی شامل تھا۔ جب باپ کے

مرنے پر چچا کے گھر منتقل ہوا تو چوں کہ چچا ہر وقت خاموش اور تنہا رہنے کو ترجیح دیتے تھے لہٰذا اسد بھی اس تنہائی میں اپنی تصوراتی دنیا میں کھو کر کئی طرح کی کہانیاں تخلیق کیا کرتا تھا لیکن وقت و حالات نے اسے یہ کہانیاں محفوظ کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اسد ایک ذہین طالب علم تھا۔ پڑھائی میں اچھا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کھیلوں میں بھی بہت تیز تھا۔ اس ضمن میں اس نے بہت سے انعامات اور وظائف بھی حاصل کیے۔

زمانہ طالب علمی میں وہ ایک بہترین تیراک بھی تھا لیکن اسی زمانے میں جب اسے دمہ جیسی موذی بیماری نے اپنے شکنجے میں لیا تو پڑھائی کے ساتھ ساتھ اس نے تیراکی کو بھی خیر آباد کہہ دیا۔ اس بیماری میں اضافے کی وجہ سے اسد کی زندگی بے آب و گیاہ صحرا کی مانند ہو جاتی ہے۔اس کے چچا بہت سے اچھے ڈاکٹروں سے اس کا علاج بھی کراوتے ہیں لیکن بیماری مستقل بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اسد اپنے چچا کے کہنے پر مظفر آباد آزاد کشمیر کے ایک گاؤں گمشد میں ایک حکیم محمد عمر کے پاس علاج کی غرض سے جاتا ہے جو جڑی بوٹیوں کو پیس کر لوگوں کی مختلف بیماریوں کا علاج کرتا ہے۔

اسد کو بھی حکیم کے علاج سے کافی افاقہ ہوتا ہے اور پہلی ہی خوراک سے وہ اپنی سانس کو ہموار محسوس کرتا ہے۔ حکیم محمد عمر عرصہ دراز سے گمشد میں اپنی بیٹی کے ساتھ رہائش پذیر ہوتا ہے۔ اس حکیم کے بارے میں گاؤں کے لوگ مختلف آرا رکھتے ہیں۔ ناول ''باگھ'' میں اس سلسلہ میں اسد اور میر حسن جو کہ حکیم کے پاس جڑی بوٹیاں پیسنے کا کام کرتے ہیں ان کے خیالات ملاحظہ کیجیے:

> "اس کی زمینیں اور مکان وغیرہ کہاں سے آئے؟ پیسے والا ہے۔ گمشد میں آتے ہی اس نے زمین خرید لی تھی، پھر مکان بنوایا، پہلے کھیتی باڑی کرتا رہا، پھر دوا دینی شروع کر دی۔ ایک دفعہ ایک مسافر ادھر سے گزرا تھا۔ اس نے یہ بات کی کہ وہ اس کو جانتا ہے، جب یہ نیچے میدانوں میں ہوا کرتا تھا۔ اس کی عورت کسی کے ساتھ بھاگ گئی تو یہ اوپر چلا آیا۔ مگر پکا پتا کسی کو نہیں چلا کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ میرے تائے نے یہ بات بتائی تھی۔"(۳)

اسد بھی دوران علاج ولی، میر حسن، احمد علی اور دیگر لوگوں کی طرح حکیم کے مطب میں جڑی بوٹیاں پیسنے کا کام شروع کر دیتا ہے۔ حکیم اسد کو اپنے گھر کے فرد کی حیثیت دیتا ہے اور ساتھ ہی اسے یہ بھی سمجھاتا ہے کہ وہ گمشد کے غریب کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ زیادہ میل جول نہ رکھے بلکہ ایک فاصلہ قائم رکھے۔

حکیم کے اس رویے کے ذریعے عبداللہ حسین نے یہ باور کروایا ہے کہ بے شک جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ تو ہو چکا لیکن جاگیردارانہ ذہنیت اپنی جگہ پر قائم ہے بلکہ جاگیرداری نے سرمایہ داری سے دوستی کر لی ہے اور یوں معاشرے میں ایک نیا استحصالی اعلیٰ طبقہ وجود میں آیا۔ اسد کی حکیم کے گھر کے فرد کی حیثیت اختیار کرنا ہی دراصل اس کی اسی طبقے میں

تبدیلی کو ہی ظاہر کرتا ہے۔ ہر ذات اور ہر برادری سے تعلق رکھنے والوں کی اپنی ایک ذہنی سطح اور نفسیات ہوتی ہے جو انسان کے احساس و کردار اور سوچ وجذبات پر مثبت یا منفی اثرات ڈالتی ہے۔ یہی اثرات اسد پر بھی دکھائے گئے ہیں کہ جب وہ حکیم کی نصیحت کے بعد اپنے ساتھ کام کرنے والوں سے فاصلہ محسوس کرتا ہے۔اس ضمن میں ناول ''باگھ'' سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اس روز جب میر حسن نے اسد سے کہا تھا۔ ہماری طرف نہیں دیکھتے؟ اسد نے پہلی بار ٹھیک سے ان کی طرف دیکھا تھا، اور ان کی نظروں کی ٹکٹکی اور کھرلوں ہمام دستوں وغیرہ کے اندر ان کے ہاتھوں کو اندھے انجان چکروں میں گھومتے ہوئے دیکھ کر اس نے خوف اور کراہیت سے نظریں پھیر لی تھیں"(۴)

حکیم کی بیٹی یاسمین ناول باگھ کا نسوانی کردار ہے جو کہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یاسمین کو برملا اس ناول کا واحد مکمل اور بھر پور نسوانی کردار کہا جاسکتا ہے۔یاسمین میٹرک پاس ہے اور باپ کے ساتھ گمشد میں رہتی ہے۔ گھر کا انتظام اور دیکھ رکھ اس کی ذمہ داری ہے۔ جب اسد اور یاسمین ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے جذبہ عشق پروان چڑھنا شروع ہوتا ہے۔ یاسمین اسد سے اتنی محبت کرتی ہے کہ وہ اپنا ہر دکھ سکھ اور تمام خوشیاں اسد کی ذات سے منسوب کر دیتی ہے اور آخری وقت تک ایک مضبوط ستون اور وفا شعاری کے پیکر کی مانند اسد کے ساتھ ثابت قدم رہتی ہے۔ اسد کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت بالآخر یاسمین کی زندگی کا روگ بن جاتی ہے۔

جب کبھی اسد کی رفاقت اور محبت یاسمین کو میسر آتی ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام خوشیاں اس کے قدموں میں ہیں۔عبداللہ حسین کے ناولوں میں خواتین جس طرح جلوہ گر ہوتی ہیں وہ انھیں قدرے منفرد بنا دیتا ہے کیوں کہ کوئی نہیں جانتا کہ کس لمحے وہ کیا کرنے اور کہنے والی ہیں۔ ان کے ہاں عورت نہ صرف مرد کی تکمیل کا باعث بنتی ہے بلکہ محبت کے حوالے سے بھی بہت متحرک اور فعال ہے بالکل یاسمین کی طرح جو اپنے محبوب سے بے تحاشا محبت کرتی ہوئی محبت کی انتہا کو پہنچتی ہے۔عبداللہ حسین کے ناولوں میں عورت کا وجود غیر مرئی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ٹھوس بدن رکھنے والی ایسی عورت ہے جو اپنے محبوب پر اپنے بدن کے اسرار کا انکشاف کرتی ہے اور اپنی بے تابیوں کا برملا اظہار بھی کرتی ہے۔

ان کے ناول باگھ کی یاسمین ایسی ہی عورت کی ہلکی پھلکی مثال ہے جو نہ صرف مرد کے ہر جذبے کو اُبھارتی ہے بلکہ اپنے محبوب کے ہر مشکل وقت میں اس کی ڈھارس بن کر اسے سنبھالتی بھی ہے۔اس ناول میں دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ ایک باگھ کی کہانی بھی موجود ہے جو صرف رات کو سیدھے سادے اور معصوم لوگوں کو ڈراتا ہے۔ دن کے وقت تو اس باگھ کو کسی نے نہیں دیکھا البتہ راتوں کو اس کی خوفناک دھاڑ سبھی کو سنائی دیتی ہے۔

دراصل یہاں باگھ کو خوف کی ایک معنی خیز علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ایک ایسا خوف جو انسان کے ساتھ ہی پرورش پاتا ہے اور کبھی انسان خوف پر تو کبھی خوف انسان پر حاوی ہو جاتا ہے۔ یہ باگھ پاکستانی فوجی نظام کے ظلم و جبر کو دکھاتے ہوئے ناول میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ انسانی تاریخ میں بہت کم عرصہ ایسا آیا جب انسان کو سچی آزادی نصیب ہوئی۔ انسان عام طور پر جبر اور اذیت کا شکار رہا ہے۔ کبھی یہ جبر و اذیت فوج کی طرف سے تو کبھی معاشرے کے فرسودہ قوانین اور روایات کی طرف سے ہوا، اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو انسان نے اپنی پیدائش سے لے کر موت تک بہت سے جبر دیکھے۔

انسانی زندگی چاہے پاکستان کی ہو یا دیگر ممالک کی اس پر بہت سے جبر آزمائے جاتے ہیں اب انسان ان سے کیسے بچتا ہے یا نہ بچ کر زندہ رہتا ہے یہی انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور ضروری نہیں کہ یہ سب سیاسی ہی ہوں بلکہ اس کی کئی اقسام ہیں۔ انسانی زندگی جدوجہد مسلسل کا دوسرا نام ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک فرد زندگی کی کسی بھی اسٹیج پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس کے تمام مسائل حل ہو گئے ہیں اور اب وہ پرسکون زندگی گزار سکتا ہے۔

باگھ کا اسد بھی یک ایسا ہی کردار ہے جو مستقل طور پر اندرونی و بیرونی جبر کے ہاتھوں ہلکان ہے لیکن ہتھیار نہیں ڈالتا۔ وہ جبر اور غلامی کے مقابلے میں مزاحمت اور آزادی کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔ اسد اور یاسمین جب چھپ چھپ کر عہد و پیماں میں مصروف ہوتے ہیں تو اسی دوران گاؤں میں یہ خبر عام ہو جاتی ہے کہ یہاں ایک باگھ موجود ہے جسے مارنا از حد ضروری ہو گیا ہے۔ اس کام کے لیے ایک بندوق کی ضرورت ہے اور وہ بندوق صرف حکیم کے پاس ہی مل سکتی ہے کیوں کہ عرصہ پہلے تلاشی کے دوران باقی سب گاؤں والوں کی بندوقیں پولیس اپنے قبضہ میں لے لیتی ہے لیکن حکیم اپنی بندوق پولیس سے چھپانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چوں کہ گاؤں کے بڑے بوڑھے کاشت کار شروع سے ہی حکیم کو مشتبہ سمجھتے تھے اور اس کے علاوہ وہ اس کی امارت سے بھی حسد و رقابت محسوس کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے فاصلہ رکھتے تھے۔ ہمارے معاشرے میں مختلف طبقات کے درمیان حسد و رقابت کے جذبات عام پائے جاتے ہیں جو بسا اوقات بہت سے معاشرتی مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ حکیم کے پاس بندوق کی موجودگی، اس کا طرز رہائش اور کھانے پینے کی اشیا کی وافروانی کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں کا اسے رشک و حسد سے دیکھنا ناول ''باگھ'' کے اس پیراگراف سے بخوبی عیاں ہے:

> " کیوں کہ گاؤں بھر میں ایک بندوق تھی جو حکیم کے پاس تھی۔۔۔ پہلے پہل کے ان دنوں میں ان بڑے بوڑھوں نے، جو اس زمانے میں بھی چالیس چالیس، پچاس پچاس کے پیٹے میں ہوں گے، اپنے کھیتوں میں کام کرتے یا آرام سے بیٹھ کر حقہ پیتے، کھانا کھاتے ہوئے کئی بار اسے گاؤں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ گزرتے، خاکی کینوس

کے خول میں بندوق کو کندھے سے لٹکائے، سیدھا سامنے دیکھ کر چلتے ہوئے گاؤں سے نکل کر نیچے وادی میں اترتے یا چوٹی والے جنگل میں چڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر کہیں سے ایک تیز دھماکے کی آواز آتی اور تھوڑی دیر میں وہ ایک مردہ پرندے کو، کسی بھٹ تیتر یا جنگلی کبوتر کو ہاتھ میں لٹکائے واپس آتا دکھائی دیتا۔ پھر گھر کے صحن میں وہ کوئلوں کی آگ پر اس پرندے کو بھون کر کھاتا۔۔۔ ان لوگوں کو اس شخص کی خود کفالتی کا عجیب نامانوس سا احساس دلاتی۔ گاؤں والوں کے ہوش میں وہ پہلے فائر تھے جو ان لوگوں کے اپنے گاؤں کے کسی باشندے کی بندوق سے ہوئے تھے۔ یہ جان کر جہاں گاؤں والوں کو فخر کا احساس ہوتا، وہاں اس شخص کا انجان ماضی، اس کے بے زن اور بے طلب، بے محنت زندگی، اس کا روپیا، ان کو اس سے دور دور رکھتا۔"(۵)

مذکورہ اقتباس سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ گاؤں کے وہ غریب کاشت کار، کسان اور دہقان جو محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں اور بہ مشکل ضروریات زندگی پوری کرتے ہیں وہ اپنے سامنے ایک خوشحال اور پرسکون انسان کو دیکھ کر کیا کیا محسوس کرسکتے ہیں یعنی یہ رشک اور رقابت فطری جذبہ ہے۔

حکیم دولت اور بندوق دونوں کا ہی مالک تھا۔ بندوق اس کی طاقت کی اور دولت اس کے خوشحال ہونے کی علامت تھی اور اسے دیگر گاؤں والوں سے اعلیٰ و برتر بناتی تھیں۔ وہ دہقان جو حکیم سے فاصلہ رکھتے تھے اب انھیں اپنی جان کی حفاظت کے لیے بندوق کی ضرورت حکیم کے دروازے پر کھینچ لائی تھی، لیکن حکیم نے بندوق دینا تو دور کی بات وہ اس کے وجود سے ہی انکاری ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی بیٹی کے کہنے پر بھی گاؤں والوں کو بندوق نہ دی اور یوں دہقانوں کی حسد و رقابت بھی کھل کر سامنے آگئی۔ بوڑھے کاشت کاروں اور حکیم کے درمیان اس گفتگو کو ناول ''باگھ'' میں کچھ اس طرح سے پیش کیا گیا:

"وہ بوڑھا دہقان، کسی تمہید کے بغیر فوراً برسرِ مطلب آگیا اور بولا کہ انھیں بندوق مانگنے کی ضرورت آپڑی تھی۔ دوسرے بوڑھوں نے بیک وقت بے معنی ہوں ہاں کرکے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور پھر حکیم نے پہلی بار منہ کھولا اور کہا کہ اس کے پاس تو اب کوئی بندوق نہ تھی۔۔۔ تڑے مڑے کاغذ سے شکن دار چہروں میں کہنہ آنکھیں بے اختیاری سے بھڑک اٹھیں۔ پانچوں کے پانچوں بڈھے ایک ایک کرکے اٹھنے لگے۔ "اچھا صلہ دیا" ایک بڑبڑایا، پھر اچانک مڑ کر ایک لمبی الزامیہ انگلی حکیم

کی آنکھوں کے سامنے ہلا کر اونچی آواز میں بولا: ہم تمھارے اوپر اعتبار کر کے آئے تھے، حکیم۔ کم سے کم ایک بار زندگی میں یہ ثابت کر دیتے کہ تمھیں ہمارا درد ہے۔" (۶)

اس گفتگو کے بعد پانچوں بوڑھے تو غصے میں نکل گئے لیکن اسی رات حکیم کو اس کے مطب میں پر اسرار طور پر کسی نہ معلوم فرد نے قتل کر دیا حالانکہ اس رات قتل کے وقت یاسمین اور اسد دونوں ہی گھر پر موجود نہ تھے لیکن موقع واردات سے میر حسن کے بھاگ جانے پر اسد زیرِ عتاب آ جاتا ہے۔ یہاں ناول نگار نے اس تلخ حقیقت کو عیاں کیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اکثر کسی کا گناہ کسی دوسرے کے سر آ جاتا ہے اور جب وہ بے گناہ انسان اپنے حواس پر قابو نہیں پا سکتا تو بہت بری طرح پولیس کے شکنجے میں پھنس جاتا ہے۔

جیسا کہ اسد کی طبیعت میں پایا جانے والا لاابالی پن اسے لے ڈوبتا ہے اور یوں پولیس اسے تفتیش کے بہانے لے جاتی ہے۔ اسد یہاں معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں دیتا اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی مناسب تدبیر بھی اختیار نہیں کرتا جس کی وجہ سے وہ دوران قید بے شمار تکالیف برداشت کرتا ہے۔ اگر اسد موقع کی نزاکت کو سمجھ کر سنجیدگی کا مظاہرہ کرتا اور اصلیت کا کھوج لگاتا تو کبھی دلدل میں نہ پھنستا۔ اسد کی گرفتاری کے بعد عبداللہ حسین نے اس ناول میں پولیس کی بول چال اور گندی ذہنیت پر سے بھی پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

عبداللہ حسین نے اس حقیقت کو عیاں کیا ہے کہ ہمارے ہاں کی پولیس کس طرح کا طریقہ تفتیش اختیار کرتی ہے اور بے گناہ لوگوں کو پائے کا مجرم بنا دیتی ہے۔ مصنف نے کھل کر پولیس کی کارکردگی اور بے ہودہ گوئی پر بحث کی ہے۔ ہماری پولیس سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنانے کی بھی ماہر ہے۔ جس طرح ناول "باگھ" میں یاسمین کے بیان میں ملاوٹ کر کے اسد پر دائرہ حیات تنگ کیا گیا۔ اسد کو بنا کسی ایف آئی آر کے جیل میں بند کر کے اس پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ جب پولیس کے بار بار کہنے پر بھی اسد نے اقبال جرم سے انکار کیا تو دیکھئے پولیس نے اسد کے ساتھ کیسا ناروا رویہ اور گندی زبان اختیار کی:

"تھانیدار نے سوال کیا:

اقبال جرم کر رہے ہو؟

کیسا اقبال جرم؟

کہ تو نے اپنی ماں کے ساتھ زنا کیا ہے، اور کیسا۔

اسد باری باری ہر ایک کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" اسد نے پوچھا۔

اس بڈھے کو قتل کیا ہے۔

''نہیں۔''

تھانیدار نے کس کر دو تھپڑ اس کے منہ پر مارے۔''(۷)

اب اسد کو تھک ہار کر پولیس نے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا لیکن اگلے ہی دن پھر اسے تھانیدار کے سامنے پیش کر کے مجبور کیا گیا کہ جو جرم اس نے نہیں کیا اسے وہ قبول کرلے۔اس واقعہ کو ناول ''باگھ'' میں یوں بیان کیا گیا ہے:

"اس کا بازو چھوڑنے سے پہلے سپاہی نے اسے جھنجھوڑ کر سیدھا کھڑا ہونے کی تنبیہ کی۔

دماغ ٹھکانے آیا؟'' تھانیدار نے پوچھا۔

''میرا دماغ ٹھکانے پر ہے۔''

'' گویا تم اقبال جرم کر رہے ہو؟''

''میں کسی ایسی بات کا اقبال نہیں کر رہا جو میں نے نہیں کی۔''

''... تمھیں معلوم ہے اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟''

'' کیا ہو گا؟''

''میں تمھیں بتاتا ہوں۔اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ساری عمر یہاں...'' اس نے اپنا ڈنڈا اٹھا کر حوالات کی کوٹھری کے جانب اشارہ کیا... ''سڑتے رہو گے۔''(۸)

مصنف نے پولیس کے رویہ کی انتہا درجہ پر سفاکی دکھانے کی کوشش کہ ہے کہ ہمارا یہ قومی ادارہ کس طرح کے ناجائز کام کرتے ہوئے معاشرے کے لیے ناسور بن چکا ہے۔اسد کو نہ صرف حبس بے جا میں رکھا گیا بلکہ پولیس نے اسے اقبال جرم کروانے کے لیے انتہائی غلیظ ہتھکنڈے استعمال کیے مثلاً اسے برہنہ کرنا اس کے جسم کے انتہائی نازک حصوں پر ہاتھ پھیرنا،اس کے پاخانے کے برتن کو اس کے پاس رکھنا اسے خالی نہ کرنا اور سخت سردی میں اسے ننگے فرش پر زنجریں ڈال کر بیٹھانا وغیرہ۔اسد پابندیوں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔

اس کی قوت فیصلہ اس قدر کمزور کر دی جاتی ہے کہ اسے پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کس راستے پر چل رہا ہے اور یہ کہ وہ راستہ اسے کامیابی کی منزل تک لے جائے گا کہ بھی نہیں۔اسد مفاہمت پرست نہیں بنتا اس کا کام صرف مزاحمت کرنا ہے نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو۔ناول میں اسد ہر ایک کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے۔

رہائی کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارتا ہے لیکن اس کی ہر کوشش ہر مزاحمت بے کار جاتی ہے اور اسے انصاف نہیں ملتا۔اس حوالے سے ناول ''باگھ'' کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"یہ میرا چاقو نہیں۔تم جھوٹا چاقو مجھ پر ٹھونس رہے ہو۔"اسد دونوں ہاتھ پشت پہ باندھ کر دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا،" میں کسی وکیل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" وکیل سے" تھانیدار نے طنزاً دہرایا۔ کس وکیل سے۔اچھا۔ ایڈوکیٹ جنرل کا انتظام نہ کر دوں تیرے لیے؟"یہ میرا حق ہے۔تم مجھے اس طرح یہاں نہیں رکھ سکتے۔تم مجھ پر تشدد کر رہے ہو۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں صرف ایک گواہ ہوں۔۔۔ مجھے عدالت میں پیش کیوں نہیں کرتے؟ میں بے قصور ہوں۔انصاف میرا حق ہے۔"(۹)

یہاں عبداللہ حسین نے ہمارے ملک کے منصفوں کے کردار کی کلی کھول دی کہ اگر پولیس والے چاہیں تو کس طرح بے گناہوں کی زندگیوں سے کھیل جاتے ہیں۔ پولیس کا اسد کے ساتھ غیر انسانی سلوک انسانی حقوق کی پامالی کی بہترین عکاسی ہے۔محکمہ پولیس کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے ہمارے ملک کے محکمہ جنگلات پر بھی بھرپور نگاہ ڈالی ہے۔ اسد کا دوست شاکر گمشد میں بطور فارسٹر تعینات ہے۔

اس کی شخصیت چال ڈھال الغرض کہ ہر انداز سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں سرکاری ملازمین چاہے چھوٹے عہدوں پر ہی فائز کیوں نہ ہوں ان کے ٹھاٹ بھاٹ اور طرز زندگی معاشرے کے عام اور غریب عوام سے مختلف ہوتی ہے۔ ان کی سوچ و تصورات بھی انھیں عام لوگوں سے جدا کرتے ہیں۔ یہاں شاکر کو بھی اسی قسم کا سرکاری ملازم دکھایا گیا ہے جو گمشد کے جنگل میں پر تعیش کی زندگی بسر کر رہا ہے اور شکار کا شوقین بھی ہے لیکن شیر کے شکار کے لیے جنگل نہیں جاتا اور اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ ایک دن باگھ خود اس کے پاس شکار ہونے کے لیے آئے گا۔

عبداللہ حسین نے اس ناول باگھ میں خفیہ انٹیلی جنس ایجنسی کو بھی موضوع گفتگو بنایا ہے اور اس ادارے کو ذوالفقار نامی کردار کے ذریعے نمایاں کیا ہے۔ ذوالفقار سرکاری خفیہ ایجنسی کا ملازم ہے۔ ایک طرح سے یہ شخص ہماری پوری قوم کا نمائندہ ہے جو آزاد فضاؤں میں سائنس لے رہی ہے اور سرحد پار ہندوؤں کی غلامی میں پھنسے مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کو آزاد دیکھنے کی خواہش رکھتی ہے۔

دوران حراست جب پولیس اسد پر ذہنی و جسمانی تشدد کی انتہا کر دیتی ہے یہاں تک کہ اسد کو اپنی موت سامنے نظر آنے لگتی ہے تو اس وقت ذوالفقار اسد کو ملنے حوالات جاتا ہے اور اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے قانونی حکمت عملی اور بچ نکلنے کے طریقے سمجھاتا ہے۔ اسد کو ذوالفقار کی باتیں اپنی طرف مائل تو کرتی ہیں لیکن اس وقت وہ ذوالفقار کی بات نہیں مانتا۔ اسد ذوالفقار کی رائے کو ناول ''باگھ'' میں یوں بیان کیا گیا ہے:

''مگر میری حالت سے ان باتوں کا کیا تعلق؟ اس نے کہا"عہد، اقتدار، قانون، میرا ان سے کیا واسطہ؟ میں تو یہاں۔۔۔اس نے ہتھکڑی کی زنجیر کو جھٹکا دیا۔"۔۔۔قیدی

ہوں اور مجھ پر تشدد ہو رہا ہے۔ مجھے آج تھانیدار نے بتایا ہے کہ سرکاری طور پر میری گرفتاری ہی عمل میں نہیں آئی۔ گویا میں یہاں پر موجود ہی نہیں ہوں۔ یہاں کوئی سننے والا نہیں؟''(۱۰)

اسد اور ذوالفقار کے مابین ہونے والی اس بات چیت سے صاحب اقتدار لوگوں کا استحصالی رویہ ظاہر ہوتا ہے یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ یہاں یہ بتانے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ ایک خاص ڈکٹیٹر شپ کس طرح انسانوں کو اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہوئے بطور انسان ان کا حق تلف کر دیتی ہے۔ ذوالفقار بھی اس استحصالی برادری کا ایک مہرہ ہے جو اسد کو حوالات سے آزاد کروا کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ جب اسد کو رہائی نصیب ہوتی ہے تو وہ ذوالفقار کے متعلق سوچتا ہے تو اس پر ایک حقیقت کھلتی ہے کہ:

ناول کا پہلا حصہ ظاہری طور پر اسد اور یاسمین کی محبت کی کہانی ہے لیکن گہرے مطالعہ سے پتا لگتا ہے کہ بادی النظر اس حصہ میں ناول نگار نے گمشدکے غریب لوگوں کا رہن سہن معاشرت، باگھ کا خوف، حکیم کا قتل لیکن اس کے پس پردہ پولیس سٹیشنوں پر بے گناہ لوگوں پر ہونے والا ظلم وزیادتی، فوجی آمریت اور معصوم لوگوں کا استحصال دکھیا ہے۔ بالخصوص پولیس کے طریقہ تفتیش کے تو وہ ہولناک مناظر دکھائے ہیں کہ جن کو پڑھتے ہوئے بھی قاری کی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ناول نگار عبداللہ حسین نے بڑی خوبصورتی سے ناول کے دوسرے حصہ کو کشمیر کی جانب موڑا ہے اور اس حصہ کی شروعات سورہ ہود کی آیت نمبر ۱۰۰ بمعہ ترجمہ سے ہوتی ہے۔

اس پاک آیت اور اس کے ترجمہ کے ذریعے کشمیریوں کی بستیوں کے حالات، انسانوں کی طرز معاشرت اور ان کے رنج والم کی تصویر کشی کی ہے۔ ریاست جموں وکشمیر براعظم کے تقریباً درمیان میں شمال کی جانب واقع ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے کشمیر انتہائی اہمیت کا حامل خطہ ہے۔ جموں وکشمیر ایک زرعی ریاست ہے اور یہاں کے اسی فیصد لوگ زراعت کے شعبہ سے منسلک ہیں۔ یہ ریاست معدنی دولت سے بھی مالا مال ہے اور گھنے جنگلات اس ریاست کا عظیم سرمایہ ہیں۔

جموں وکشمیر جسے مقبوضہ کشمیر بھی کہا جاتا ہے ایک اندازے کے مطابق یہ جنت نظیر تقریباً ۸۴،۴۷۱ مربع میل پر پھیلی ہوئی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان تقسیم ہو کر دنیا کے نقشے پر ابھرا تو اس وقت ریاست کشمیر پر ایک ہندو راجا کی حکومت تھی جو بہ خوبی یہ جانتا تھا کہ کشمیری مسلمان پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں اور جغرافیائی اعتبار سے بھی یہ خطہ پاکستان سے ہی ملتا ہے لیکن ہندو ہونے کی وجہ سے راجا ہری سنگھ ریاست کا الحاق پاکستان سے کرنے پر تیار نہ تھا اور یوں ہندو انگریز گٹھ جوڑ سے کشمیر کو پاکستان کی بجائے ہندوستان کا حصہ بنا دیا گیا اور یوں ایک نئی لڑائی کا آغاز ہوا۔

مسلمانان کشمیر پر ہونے والے ظلم وستم کی داستان پورے براعظم کے مسلمانوں تک پھیل رہی تھی۔ کشمیریوں کی مدد کے لیے قبائلی پٹھان آگے بڑھے اور انھوں نے راجا کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا اور کشمیر میں داخل ہو گئے۔ کشمیری

مسلمان جو پہلے ہی سے آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے اور کافی حصہ راجا سے آزاد کروا چکے تھے اب مزید مستحکم ہو گئے۔ قصہ مختصر یہ کہ اس وقت جو حصہ مسلمانوں نے آزاد کروایا اسے آزاد کشمیر اور جو ہندوستان کی ساز باز اور واویلے سے ہندوستان کے تصرف میں رہ گیا اسے مقبوضہ کشمیر کا نام دیا گیا۔مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں پر زندگی کو مزید تنگ کر دیا گیا۔

اس وقت بھی ہندوستان پوری دنیا کو یہ باور کروا رہا ہے کہ آزادی کشمیر ایک علاقائی مسئلہ ہے یعنی ہندوستان اور پاکستان کا داخلی معاملہ اور یوں وہ بڑی ڈھٹائی سے پوری دنیا کی آنکھوں میں کشمیریوں کو دہشت گرد قرار دیتے ہوئے دھول جھونک رہا ہے۔ اس وقت بھی صورتحال یہ ہے کہ بھارتی حکومت ہر روز ایک نیا ظالمانہ قانون متعارف کروا رہی ہے اور کشمیریوں کے حقوق کو بابانگ دہل پامال کر رہی ہے۔

ہندوستانی فوج کشمیر میں قتل و غارت، عورتوں کی عزتوں سے کھیلنا، املاک کی تباہی اور بے گناہ نہتے کشمیریوں کو ٹارچر سیلوں میں اذیتیں دینے کا عمل سفاکی سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ سرحد پار جو عملی جنگ لڑی جا رہی ہے اسد بھی اس کا ایک مہرہ بن جاتا ہے۔اس کی باقاعدہ تربیت کی جاتی ہے اور اس کا نام اور حلیہ بدل دیا جاتا ہے۔ اسد ایک دیہاتی کشمیری علی کے نام سے سرحد پار کرتا ہے اور وہاں پر موجود ان لوگوں سے جاملتا ہے جو باغی ہیں اور خفیہ کاروائیوں میں ملوث ہیں۔دیکھئے ناول ''باگھ'' کا یہ حصہ:

> "اب تم دنیا کے واسطے ایک شخص بنام علی ہو، آج سے تمھارے اوپر علی مراد ولد شہباز قوم اجاڑ سکنہ نو پہاڑ پیشہ مزدور کی ذاتی ذمہ داری ہی نہیں، بلکہ تمام تر اخلاقی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔"(۱۱)

ناول نگار نے اسد کے ذریعے کشمیر میں پائے جانے والے نسلی امتیازات بھی دکھائے ہیں جن کا مختصر سا خاکہ ناول ''باگھ'' میں کچھ اس طرح سے پیش کیا گیا:

> تم کشمیری ہو؟
> "اصل کشمیری، ہم لوگ اصحابیوں کی اولاد میں سے ہیں"
> "اصل کشمیری تو براہمن ہیں"
> اسد شرارت سے بولا۔
> "ہمارے ہی بھائی بندے تھے" وہ حقارت سے بولا، "آریہ سماجیوں نے پکڑ کر براہمن بنا دیے۔"(۱۲)

مقبوضہ کشمیر میں رہتے ہوئے اسد نے وہاں کے لوگوں کی زندگی، ان کی بھوک اور افلاس کا مشاہدہ بھی کیا۔یہ لوگ کھیتی باڑی اور جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور گزر بسر کرتے ہیں یعنی کہ یہ لوگ زندگی کو نچلی سطح پر جی رہے ہیں۔مقبوضہ کشمیر میں جب سلطان، اسد کو اپنے بھتیجے ریاض کے ساتھ اس کے گھر بھیجتا ہے تو اسد ریاض کے اندر ایک

بغاوت کو محسوس کرتے ہوئے اس سے پوچھتا ہے کہ وہ یہ خون خرابے کا کام کیوں کرتا ہے جب کہ اُسے پیسوں کی بھی حرص نہیں اور نہ کسی اور چیز کی لالچ ہے پھر کیوں وہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتا ہے۔

دراصل ریاض کے سرکش مزاج کے پسِ پردہ مصنف نے اُس بے انصافی کو عیاں کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے معاشرے میں صرف غریب لوگوں کے ساتھ کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں دولت والے لوگ اپنے لیے خود قانون بناتے ہیں۔ ریاض اور اسد کی گفتگو امیروں اور غریبوں کے درمیان پائے جانے والی نفرت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ قانون صرف بڑے لوگوں کے مفاد اور تحفظ کی خاطر بنائے جاتے ہیں جب کہ غریب لوگ ناحق ان قانونی شکنجوں میں دھر لیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غریبوں میں ان قوانین کے خلاف نفرت اور بغاوت پائی جاتی ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں تو ایسے قانون بے شمار ہیں جن سے کشمیریوں کی حق تلفی ہو رہی ہے اور جس کی وجہ سے ریاض جیسے لوگ تخریبی کاروائیوں میں شامل ہوتے ہیں۔ ریاض اس ناول کا ایک بہت فعال کردار ہے جو اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی زندگی کو تحریک آزادی کے لیے وقف کر دیتا ہے اور بالآخر دردناک شہادت حاصل کرتا ہے۔ ریاض ان شہیدوں میں شامل ہے جو اپنی خاندانی روایات برقرار رکھتے ہوئے بڑی بہادری سے لڑتے ہیں اور اپنی سرزمین کو غیروں کے تسلط سے آزاد کروانے کے لیے کوشاں ہیں۔ ناول ''باگھ'' میں تحریک آزادی کشمیر کے ساتھ ریاض اور اس کے خاندان کی وابستگی کے بارے میں ریاض کی ماں اسد کو بتاتی ہے:

> "میں ریاض کے باپ کو منع کیا کرتی تھی۔ ریاض کا باپ سلطان کا بڑا بھائی تھا۔ دونوں بھائی حکومت کے مخالف تھے۔ اصل آدمی تو ریاض کا باپ تھا، سلطان تو چھوٹے بھائی کی طرح اس کے پیچھے پیچھے لگا رہتا تھا۔ اب سردار بن گیا ہے۔ میں کہتی ہوں خیر، ریاض کا اپنا خون ہے۔ ان کے خاندان میں بغاوت کی رسم ہے۔ جب میرے باپ نے میری رضا دی تو ہمارے خاندان میں سوگ پڑ گیا تھا۔ لوگ کہتے تھے عبداللہ اپنی بیٹی باغیوں کو دے رہا ہے۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، ایک دن ایسا غائب ہوا کہ پھر نہ آیا۔ ۔۔ جب ریاض جوان ہوا تو اپنے چچا کے ساتھ لگ گیا۔ میں کیا کر سکتی ہوں مردوں کے ساتھ جھگڑا ہو سکتا ہے بیٹوں کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے۔ مرد جائیں بھی تو نام چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ گھر اس کے نام سے آباد ہے۔ بیٹے چلے جائیں تو کچھ بھی چھوڑ کر نہیں جاتے۔"(۱۳)

ناول باگھ میں عبداللہ حسین نے ہر چیز کو اس کی پوری جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ وہ ایک

مصور کی طرح ہر کردار، ہر منظر اور اس کے پس پردہ عوامل کو ایک لڑی میں پروتے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کو پڑھتے ہوئے پڑھنے والا اپنے آپ کو کبھی تو گمشد میں پاتا ہے اور کبھی وہ کشمیری ماحول میں رچ بس جاتا ہے۔

مصنف نے جہاں گاؤں گمشد کے دیہی مناظر و ماحول کی دلکشی اور معاشرتی مسائل کو بیان کیا ہے وہیں کشمیر کے مخصوص ماحول، وہاں کے لوگوں کے رہن سہن طرز معاشرت کے ساتھ ساتھ مقبوضہ کشمیر کی صورتحال، سیاسی اور معاشرتی ماحول و معاملات پر بھی بات کی ہے۔ گو کہ مقبوضہ کشمیر کی سنگین صورتحال حال پر کھل کر تو کوئی بات نہ کی گئی البتہ اشاروں کنعایوں میں بھی بہت کچھ سمجھا دیا گیا ہے۔

منظر نگاری کے حوالے سے ناول میں حقیقی رنگ ملتے ہیں اگر واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو کشمیر کی سیاسی بے چینی کے ساتھ ساتھ کشمیریوں کے گھروں میں پائی جانے والی غربت و افلاس کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جب اسد امیر خان کے ساتھ کشمیر کے ایک گاؤں کے گھر میں داخل ہوتا ہے تو اس گھر کی بناوٹ اور وہاں موجود بچوں اور بڑھیا کے سراپے سے ان کی بے بسی اور غریبی کا انداز بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ناول "باگھ" سے لیا گیا یہ اقتباس دیکھئے:

> " گھر صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ ایک دیوار میں مٹی کا را کھ را چولہا سرد پڑا تھا۔ چولہے کے آگے نصف دائرے میں زمین پر تین بچے پڑے تھے۔ دو چھوٹے بچے ابھی محو خواب تھے۔ جب کہ نو دس سال کی ایک بچی آنکھیں کھولے چپ لیٹی تھی۔ ایک طرف ادھیڑ عمر کی ایک عورت بیٹھی بھاری ڈنڈے کے ساتھ پتھر کی دوری میں آہستہ آہستہ کچھ کوٹ رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک کھاٹ پڑی تھی جس کی ادوائن ٹوٹ کر نیچے لٹک رہی تھی، کھاٹ پر میلے میلے پھٹے ہوئے لحاف اور کئی دوسرے کپڑے ڈھیر کی شکل میں پڑے تھے۔"[۱۴]

عبداللہ حسین کا دلکش انداز بیاں اس ناول میں بہت زیادہ اثر آفرینی اور دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ مصنف کے گہرے مشاہدے اور زیرک نگاہ نے ناول میں موجود کرداروں کی نفسیاتی کیفیت کو اجاگر کیا ہے۔ انداز بیان کے حوالے سے اس ناول میں سرشاری کی کیفیت نظر آتی ہے۔ درد بھرے تکلیف دے اور عبرت آموز واقعات کو ناول نگار نے انفرادی نوعیت کے اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مصنف نے واقعات کو حالات کے تقاضے کے مطابق منظم و مربوط رکھتے ہوئے قاری کی دلچسپی و توجہ کو ابتدا سے اختتام تک برقرار رکھا۔ عبداللہ حسین نے مختلف حالات و واقعات کو اکھٹا کر کے قصے کو طویل کیا اور جد وجہد آزادی کے تناظر میں تمام معاشرتی پہلوؤں کا بڑی توجہ اور دلجمعی سے مطالعہ و مشاہدہ کیا۔

مصنف نے ناول کی کہانی کو اپنے احساس، سوچ اور تخیل میں مکمل تحلیل ہونے کا موقع فراہم کیا اور خارجی حقائق کو اپنی داخلیت کا جز بنایا ہے۔ عبداللہ حسین جیسا لکھاری اپنے مشاہدے، تجربے اور قوت تحریر کی بنا پر جب بھی کچھ ضبط

تحریر میں لاتا ہے تو اس میں کچھ انوکھا، نرالا پن اور تازگی و توانائی پیدا ہوتی ہے۔

اس ناول میں پاکستان کے نظام اقتدار کے تضاد کو بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ایک طرف تو ہمارے حکمران کشمیریوں کی آزادی کے لیے ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کا عزم کیے ہوئے ہیں اور دوسری طرف اپنے ملک کے باشندوں کے حقوق کو پامال بھی کرتے ہیں اور انھیں اس حق سے محروم بھی کرتے ہیں۔جیسا کہ اس ناول میں اسد کو مقبوضہ کشمیر سے خبریں لانے کے لیے اس کی بیماری کے علاج والی بوٹی کے عوض اسے کشمیر جانے پر مجبور کیا گیا۔جس پر پہلے تو اسد انکار کرتا ہے لیکن پھر بیماری کے خاتمے کے لیے مجبوراً کشمیر جانے کی حامی بھر تا ہے اور جانے سے پہلے وہ اپنی محبوبہ کو بھی دوبارہ لوٹ آنے کا یقین دلاتے ہوئے یہ بھی بتاتا ہے کہ وہاں جانا ہی اس کی آزادی اور آزاد زندگی کی ضمانت ہے۔

اس ناول میں محبت جیسے جس معاشرتی مسئلے کو اٹھایا گیا ہے وہ محبت صرف دو افراد کی نہیں بلکہ انسان کی انسان سے اور فرد کی وطن سے محبت کی کہانی بھی ہے کیوں کہ زبردستی ہی سہی لیکن اسد نے اپنے وطن کی خاطر اپنی جان جوکھم میں ڈالی۔ اس کے ساتھ ساتھ کئی مزید لوگ یا کردار بھی ایسے دیکھائے گئے ہیں جو بغیر کسی لالچ کے اپنے وطن کی خاطر دیدہ دلیری سے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیتے ہیں۔

اس ناول میں محبت نے کئی روپ اختیار کیے اور وطن سے محبت کے مختلف انداز بھی یہاں ہی ملتے ہیں۔عبداللہ حسین نے ناول باگھ میں کشمیر کی آزادی کی تحریک کو ایک مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہاں پر پاکستانی نظریات سے ناول نگار کو اختلاف ہے اور یوں بھارتی پروپیگنڈے کی تصدیق ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

بھارت ہمیشہ پاکستان پر یہ الزام لگاتا آیا ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے خراب حالات کا ذمہ دار پاکستان ہے کیوں کہ یہاں پر جتنی بھی تخریب کاریاں ہوتی ہیں وہ پاکستانی جاسوس کرتے ہیں یا ان کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ بہر حال یہ سارے اعتراضات تو بھارت کی طرف سے ہر روز ہی اٹھاتے جاتے ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ آزادی حاصل کرنا کشمیریوں کا حق ہے اور اس حق کو حاصل کرنے کے لیے آج اتنے برس گزر جانے کے باوجود بھی ہر روز کشمیری اپنے خون کا نذرانہ بڑی عقیدت اور جرات مندی سے پیش کر رہے ہیں۔

کشمیریوں کی یہ تحریک آزادی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک بھارت کشمیریوں کو ان کا حق ان کی زندگی واپس نہیں لوٹا دیتے۔ اس ناول میں مصنف نے کشمیر کے واقعات ہی نہیں بلکہ ایک عہد کے جبر اور معاشرتی حالات کو بھی بیان کیا ہے۔ناول نگار نے ایک ہنگامہ خیز دور کی سیاسی،اقتصادی اور معاشی زندگی کا عکس اپنی سچائیوں اور گہرائیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ گو کہ "باگھ"،"اداس نسلیں" سے تاریخ کے حوالہ سے چھوٹا ہے پھر بھی اسے ہم تخلیق پاکستان کے بعد ہندو پاک میں لکھے جانے والے ناولوں میں یقیناً اچھے ناول کی حیثیت سے یاد رکھیں گے۔

عبداللہ حسین نے نہ صرف ماضی قریب اور حال کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کو ڈائی مینیشنز Dimensions کے ساتھ پیش کیا ہے بلکہ اپنے مخصوص وژن سے پڑھنے والوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ اسد کو سرحد پار جو بھی کام سونپ کر بھیجا گیا ان میں بیشتر کو اس نے انجام بھی دیا لیکن پھر بنا بتائے وہ اپنی جڑی بوٹی کو پانے کے بعد چپکے سے واپسی کا سفر شروع کر دیتا ہے۔ واپسی کے اس سفر میں بھوک، پیاس اور پیدل سفر جو کہ تقریباً انیس دن جاری رہا کے دوران اسد کی حالت انتہائی نہ گفتہ بہ ہوجاتی ہے۔ اس کے پیر پھٹ جانے کی وجہ سے سوجن کا شکار ہوجاتے ہیں۔ میل اور گندگی کی وجہ سے اس کا حلیہ اور اس کے کپڑے بھی ابتر حالت کا شکار ہوجاتے ہیں لیکن ان تمام تکلیف دہ مراحل، مشکلات اور بھارتی فوجیوں کی نگاہوں سے بچتا بچاتا وہ بالآخر " گمشد "پہنچ جاتا ہے۔

ناول کے آخر میں بھی ناول نگار نے حکومت اور حکومتی کارندوں کی سفاکی سے پردہ اٹھاتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب تک مجبور و بے بس لوگ ان کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنیں رہیں تب تک کوئی ان کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا لیکن جیسے ہی وہ ان کے مفاد کے لیے کام کرنا چھوڑیں تو کیسے پابند سلاسل کر دیے جاتے ہیں بالکل اسد کی طرح جو سرحد پار سے تو بہ آسانی واپس آ گیا لیکن ذوالفقار نے اس کی مخبری کروا کر کیسے اسے دوبارہ بھارتی فوجیوں کے شکنجے میں پھنسا دیا۔

ناول کے آخری حصہ میں دکھایا گیا ہے کہ اسد کو ایک کھلی جیپ میں لے جایا جارہا ہے یہاں تک کہ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ وہ لوگ کون ہیں اور اسے کہاں لے جا رہے ہیں اور اب وہ کون سے جبر سے گزرے گا۔ اس کی سوچ کو ناول ''باگھ'' کی آخری سطور میں کچھ اس طرح پیش کیا گیا:

> "میں اپنے سانس کے عارضے کی خاطر ادھر ادھر پھرتا رہا ہوں مگر ایسے ایسے عارضے کسی کو نہیں ہوتے، صرف اتنی بات ہے کہ اس بجلی پر چمک کو میں قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک میرے دل میں زور ہے۔ بس اتنی سے بات ہے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جن کو اشارہ ملتا ہے کہ وہ دوزخ میں جائیں گے اور وہ اسے تسلیم کر لیتے ہیں مگر ثابت قدم رہتے ہیں۔ اس لیے کہ دوزخ اور جنت کی کون سی بات ہے۔ ایک کیفیت ہے جو عمر کے کسی مقام پر ہر ایک کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور پھر اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے باقی رستہ طے ہوتا ہے۔ محبت کے یہ نام اور نشان میں نے پیدا کیے ہیں جو میرے رستے میں دکھائی دیتے ہیں اور کبھی ماند نہیں پڑتے۔ میں ان کو کیسے چھوڑ دوں۔ بس اتنی سے بات ہے۔ باقی یہ لوگ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں اس کا مجھے علم نہیں۔ اگر قید میں ڈالنا تھا تو اس

علاقے سے باہر کیوں لے جا رہے ہیں؟ اگر دیس نکالا دینا ہے تو اس طرح قیدی بنا کر لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ عجیب سفر ہے۔"(۱۵)

ان آخری سطروں میں عبداللہ حسین نے بہت گہرائی اور گیرائی کا ثبوت دیا ہے اور وہ سب کچھ بھی کہہ دیا جو شاید وہ کھل کر تو بیان نہ کر سکتے تھے اور جو قاری کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ رسالہ ماہِ نو کو دیے گئے ایک انٹرویو میں انھوں نے "باگھ" کے بارے میں کہا:

"پاکستان اور محبت۔۔۔یعنی محبت کی کہانی۔سوال کرنے والے نے پوچھا۔۔آپ کی محبت میں تو بہت سے آمیزے موجود ہوتے ہیں۔ سیاست سے معاشرت تک کیوں کہ باگھ بھی ایک طرح سے محبت کی کہانی ہے لیکن اس محبت نے جہاں جہاں ٹھوکریں اور جبلیں کاٹیں وہ محبت کے سودے تو ہیں؟"عبداللہ حسین جی ہاں"یہ محبت کے سودے ہیں۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہ آیا "باگھ"مزاحمتی ناول ہے؟ عبداللہ حسین نے جواب دیا۔۔ان میں تین چار موضوعات ہیں جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں اس میں ایک موضوع انصاف کا ہے۔"(۱۶)

اگر ہم ناول کے موضوع اور ناول نگار کے اس انٹرویو میں پائے جانے والے خیالات پر غور کریں تو پھر یہ تاثر ابھرتا ہے کہ اس ناول میں مصنف نے محبت کو بہت وسیع معنوں میں رکھ کر دیکھا ہے۔جس میں عورت سے محبت ضروری نہیں بلکہ انسان اس کے سائے تلے محبت کے دیگر پہلوؤں سے آشنا ہوتا ہے۔یعنی وہ آزادی، انصاف، رواداری معاشرتی اور اقتصادی آسودگی بھی طلب کرتا ہے اور وہ ان مقاصد کے حصول کے لیے جو محبت ہی کی مختلف اقسام واشکال ہیں تاحیات جدوجہد کرتا ہے بے شک اس رستے پر وہ تنہا رہ جائے یا موت کے دھندلکے میں گم ہو جائے۔

ناول اداس نسلیں کی طرح اس ناول میں بھی عبداللہ حسین نے شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے کہ معاشرے میں جو نئی سوچ اور نئی سچائیاں سامنے آئی ہیں ان کی بھرپور عکاسی کی جائے۔ اس نئی صورتحال حال میں ناول کا مرکزی کردار اسد جو آج کے دور کا ایک باشعور انسان بھی ہے مختلف جبروں سے گزر کر بھی حیران ہے کہ یہ کیسا سفر ہے؟

ناول کے اس حصّہ کو عبداللہ حسین نے تنہا تقدیروں کی اور اپنی تنہائی کے خلاف جدوجہد کی ایک دستاویز بنا دیا ہے۔ اسد کو پڑھتے وقت یہ تصور بھی ابھرتا ہے کہ آیا ناول موبی ڈگ کا ضدی و مراتی ہیرو احب Ahab تو نہیں جو زندگی کے سمندر میں ایک زبردست وہیل مچھلی (برائی یا شر) سے مقابلہ آرائی میں مصروف ہے۔ گوکہ ہرمن میلول کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غالباً اس کے پیشِ نظر یہ بھی تھا کہ احب کو کائنات یا نیچر کے مقابلے میں پسپائی اختیار کرتے ہوئے دکھایا جائے اس لیے کہ اس مقابلے میں شکست انسان کا مقدر ہے۔عبداللہ حسین کے ناولوں کے ہیرو ناآسودگی کے ایلیے

سے دوچار رہتے ہیں لیکن ان میں مزاحمت اور احتجاج کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔

باگھ؛ ناول، اداس نسلیں کے تقریباً بیس سال بعد آیا اور دونوں کا اسلوب بھی تقریباً ایک جیسا ہے لیکن باگھ میں نثر بالخصوص منظر نگاری اور مکالمے کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہے۔

مذکورہ مفصل بحث کو یوں سمیٹا جا سکتا ہے کہ عبداللہ حسین نے گمشد کی تصویر کشی، اسد کا سرحد پار کا سفر، دہشت پسندوں کی کاروائیوں کی تفصیلات، پہاڑی اور کشمیری علاقوں کے رہنے والوں کے طرز معاشرت، اسد کی گرفتاری اور دوران حراست اذیتوں کا بیان الغرض کے ہر چیز میں فنی سطح کو برقرار رکھا ہے۔ سیاسی نزاعات ساتھ یہ ناول ان معاشرتی مسائل کو اجاگر کرتا ہے جو سیاسی منظر نامے میں پوشیدہ ہیں اور جنھیں زیرِ تحقیق لا کر طشت از بام کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی گئی ہے۔ بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو ادب اور اردو کے احتجاجی ادب میں ناول باگھ ایک بنیادی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

حواشی

۱۔ عبداللہ حسین، انٹرویو، روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۳۔ جون ۱۹۸۷ء، ص ۱۰
۲۔ ایضاً، باگھ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۲
۳۔ ایضاً، باگھ، ص ۵۵
۴۔ ایضاً، ص ۵۸
۵۔ ایضاً، ص ۶۰
۶۔ ایضاً، ص ۶۴، ۶۵
۷۔ ایضاً، ص ۱۲۰
۸۔ ایضاً، ص ۱۲۱
۹۔ ایضاً، ص ۱۳۹، ۱۴۰
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۵۸
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۸۱
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۲۱
۱۳۔ ایضاً، ص ۲۲۴
۱۴۔ ایضاً، ص ۲۴۳، ۲۴۴
۱۵۔ ایضاً، ص ۲۶۸
۱۶۔ ایضاً، ص ۳۴۰، ۳۴۱

ماٰخذ

۱۔ حسین، عبداللہ، باگھ،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

اخبار

۱۔ روزنامہ جنگ،لاہور، ۱۳/ جون ۱۹۸۷ء

Reference:

1. Abdullah Hussain, *Interview*, published in Daily *Jang*, Lahore, 13th June 1987, p. 10
2. Abdullah Hussain, *Bagh*, (Lahore: Sang-e-Meel Publication, 2012), p. 12
3. Ibidi, p. 55
4. Ibid, p. 58
5. Ibid, p. 60
6. Ibid, p. 64-65
7. Ibid, p. 120
8. Ibid, p. 121
9. Ibid, p. 139-140
10. Ibid, p. 158
11. Ibid, p. 181
12. Ibid, p. 221
13. Ibid, p. 224
14. Ibid, p. 243-244
15. Ibid, p. 268
16. Ibid, p. 340-341

Bibliography:

1. Hussain, Abdullah, *Bagh*, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2012

Newspaper

1. Daily *Jang*, Lahore, 13th June 1987

❁❁